رتن ناتھ سرشار

(1902 — 1846)

سرشار لکھنؤ کے ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ 1878 میں منشی نول کشور نے ان سے "فسانۂ آزاد" نام کا ایک ناول نما قصّہ اپنے اخبار کے لیے قسطوں میں لکھوایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں سرشار کی دھوم مچ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ سرشار نے تقریباً بائیس سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ قصّہ کم و بیش ہر روز قلم برداشتہ لکھا تھا۔ کہنے کو یہ لکھنؤ کے ایک نوجوان میاں آزاد کی داستان ہے۔ جس لڑکی سے وہ شادی کرنا چاہتا ہے وہ چاہتی ہے کہ آزاد جنگِ ترکی و روس میں (جو اُس زمانے میں واقعی چل رہی تھی) ترکی کی طرف سے حصّہ لے اور وہ جب کارہائے نمایاں انجام دے کر لوٹے تبھی ان کی شادی ہو۔ لیکن کتاب کا بڑا حصّہ دوسرے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات اور قصّہ در قصّہ کی طرح مناظر پر مشتمل ہے۔ کرداروں، واقعات اور جگہوں کی اس بھیڑ میں ہنسی مذاق بھی ہے، جرم اور سزا بھی ہے۔ اس زمانے کی تہذیب کی طنزیہ یا ہمدردانہ تصویریں بھی ہیں، انگریزی تہذیب اور مزاج اور ہندوستانی تہذیب اور مزاج کا ایک دوسرے پر اثر اور ردِّ عمل بھی ہے۔ مختصر یہ کہ سرشار نے "فسانۂ آزاد" نہیں لکھا ہے بلکہ

ایک نئی طرح کی داستان لکھ دی ہے۔

"فسانۂ آزاد" کا سب سے مشہور کردار "خوجی"، یعنی خواجہ بدیع الزّماں ایک ایسا شخص ہے جو آزاد کا دوست اور ساتھی ہے۔ خوجی افیون خور، بزدل، نیم جاہل اور دل پھینک ہے لیکن اسے آزاد سے گہری محبّت ہے۔ خوجی کی حرکتیں دیکھ کر ہم کو ہنسی آتی ہے لیکن اس سے ایک طرح کی محبّت بھی پیدا ہوتی ہے۔ سرشار کو ہر طرح کی زبان پر قدرت ہے۔ وہ موقع یا اپنی پسند کی لحاظ سے سلیس اور سادہ یا فارسیت سے بھرپور یا رعایت اور مناسبت سے سجائی ہوئی عبارت بے تکلّف لکھتے ہیں۔

"فسانۂ آزاد" کے دو اقتباس ہمارے سامنے ہیں۔ دونوں جلدِ اوّل سے لیے گئے ہیں۔ پہلے اقتباس میں عورتوں کے کپڑوں اور زیوروں کے بیان کے لیے یہ موقع نکالا گیا ہے کہ ایک رئیس زادی فیٹن پر سوار گزر رہی ہے اور اس کی خادمہ ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ میاں آزاد کی نظر اُس منظر پر پڑتی ہے اور خادمہ کا سراپا میاں آزاد کی آنکھوں سے ہمیں دکھایا جاتا ہے۔

دوسرے اقتباس میں ہم خوجی کی حرکتیں دیکھتے ہیں اور اس زمانے میں ریل کے سفر کا بھی کچھ حال ہمیں نظر آتا ہے۔

مہری کا سراپا

میاں آزاد نہار مُنہ شہر میں چکّر لگا رہے تھے تو ایک دفعہ ہی کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سے ایک زر نگار پُر بہار فٹن بڑے ٹھسّے اور دھوم دھڑکّے سے آ رہی ہے۔ کہاروں کی ہری ہری وردی طوطے پھڑک، لال لال پگیا فوق البھڑک، کندھے جوڑے ہوئے شہ گام جا رہے ہیں۔ چھٹکا سرخا سرخ لال بھبھوکا، فٹن زر نگاری سواری ہے یا بادِ بہاری۔ ایک طرح دار باغ و بہار گلِ عذار شوخ و عیّار مہری ساتھ ہے۔ نظر اِدھر اُدھر مگر فٹن کے ایک کونے پر ہاتھ ہے۔ بے حجاب برافگندہ نقاب، چندے خورشید چندے مہتاب، آنکھوں میں صہبائے جوانی کا سرور، وہ حُسن وہ نور کہ ع

دیکھیے تو غش کرے اَرَنی گوئے اوجِ طور

میاں آزاد دل ہی دل میں سوچ رہے ہیں کہ اللہ اللہ جس پری کے جلَو میں ایسی ایسی چھیل چھبیلی بانکی ترچھی دنیا سے نرالی سہیلیاں ہیں وہ خود کیسی نہ ہوگی؟

اب بی مہری کی چال ڈھال اور جوڑے کا حال سنیے: فالسئی اطلس کا لہنگا ع

ناز سے پائنچے اٹھائے ہوئے

پڑاقے کی ڈیڑھ ہاتھ چوڑی سبز سُرخ گلابی آسمانی گوٹ ہے ، میاں آزاد کے کلیجے پر چوٹ ہے۔ گوٹ پر آٹھ آٹھ پلیٹیں ، اُس پر تاج بنے ہوئے ، لال گرنٹ کا نیفہ جو یاقوتِ احمر کو خون رُلائے ، اس میں فالسئی ریشمی ازار بند پڑا ہوا ، گچھے دار کرن ٹکی ہوئی۔ ہاتھ میں آٹھ آٹھ لڑ کا توڑا گنگا جمنی۔ وہ گوری گوری بہیاں اور کالی کالی لچھیاں جیسے شاخِ صندل پر مار۔ آبِ رواں کا چُست پھنسا ہوا شلوکا آستینوں دار۔ چوڑی کے کڑے شیر دہاں اور نازک نازک سبز سبز کریلیاں۔ پور پور چھلّے ، بازوؤں پر یکّہ اور جوشن۔ بلا کا نکھار ، غضب کا جوبن۔ ناک میں فیروزے کی ننھی سی کیل ، کانوں تین تین انتیاں اور بیچ میں بجلیاں۔ زلف چلیپا تا بہ کمر ، چھپکا زیبِ سر ، آگے مچھلی غیرتِ ماہ ، چاہِ زنخداں کی چاہ ، وہ دستِ حنائی اور فردی بوٹی کی دُلائی ، شربتی کا استر ، ڈیڑھ بالشت کی گوٹ ، دل لوٹ پوٹ۔ اُس پر کٹاؤ نے اور بھی کٹاؤ کیا۔ گلے میں دُھکدُھکی پڑی ہوئی ، میاں آزاد سے آنکھ لڑی ہوئی۔ کبھی بہ صد ادائے دل رُبا دُلائی کو سنبھالنا ، کبھی بالوں کو سنوارنا۔ پائینچے اٹھائے فنس کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے ، کبھی مسکراتی ہے ، کبھی کمر لچکاتی ہے۔

ریل کا سفر

الغرض میاں آزاد اور خوجی صاحب نے اسباب کسا اور اسٹیشن پر داخل ہوئے۔ میاں خوجی کو روپے دیے کہ ٹکٹ لاؤ۔ حضرت جا ڈٹے اور جس وقت گھنٹی ہوئی ٹھن ٹھن اور کانسٹبل نے کہا کہ کانپور کے مسافرو چلو! ٹکٹ بٹ رہا ہے۔ خوجی بھی لپکے اور وہ ریلا آیا کہ خدا کی پناہ۔ ایک ایک پر دس دس گرے پڑتے ہیں۔ بیس واڑے کے دس بارہ کشیدہ قامت جوانوں میں حضرتِ خوجی جو پھنسے تو کچلنے لگے۔ وہ ڈنڈ پیل لحیم و شحیم کرارے جوان ، یہ بے چارے نیم جان۔ قد ماشاء اللہ پون انچ کا ، بہت ہی گھبرائے اور یار لوگ جو بھڑ بھڑا کر دھنس پڑے تو ان کے ہاتھ پاؤں گویا شکنجے میں کس گئے۔ جب کچلنے لگے تو غل مچایا کہ لانا قرولی! دو ایک کو تو یہیں شہید کر دوں۔ اتنا سننا تھا کہ بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی اور میاں خوجی درّاتے ہوئے ٹکٹ کی کھڑکی کے پاس پہنچے۔

خوجی : بابو صاحب! ٹکٹ دیجیے۔

بابو : گول مت کرو۔ (غُل مت کرو۔)

خوجی : اجی غل تو سنتے ہو مگر اِس غولِ بیابانی پر نظر ہے ؟

بابو : چُپ !

خوجی : چُپ ! یہ چُپ کیسی ؟ ٹکٹ دیتے ہو یا میں اسٹیشن ماسٹر سے رپٹ بولوں پھر؟

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ پھر ریلا۔ وہ ریل پیل کہ میاں خوجی کے پنتھّر ہی بگڑ گئے۔ رپٹ وپٹ سب بھولے اور کوئی بیس قدم پیچھے ہو گئے۔ خیر بعد خرابیِ بصرہ، خدا خدا کر کے ٹکٹ ملے اور جا کر ریل پر بیٹھے۔

ریل چلی تو میاں خوجی کو آزاد نے جگایا کہ اٹھیے جناب خواجہ صاحب! کانپور آ گیا۔

خوجی : واللہ ! بھئی واہ ری ریل ! ایک ہی مرتبہ کی پینک میں کانپور پہنچ گئے۔

معنی اور اشارے

فنس = یہ لفظ اصل میں "فِینَس" اور "پینس" ہے۔ اُس زمانے میں "فِنس" بھی بولتے تھے۔

نہار مُنہ = صبح کے وقت ، بغیر ناشتہ کیے

طوطے پھڑک = طوطے کے رنگ کو مات کرنے والا گہرا ہرا

پگیا = پگڑی

شہ گام جانا = بڑے بڑے قدم بڑھانا

چِھٹکا = فنس کا رنگین پردہ

مہری = خادمہ

اَرَنی گوے اوجِ طوُر = طوُر (پہاڑ کا نام) کی اونچائی پر جا کر" اَرَنی" (مجھے اپنا جلوہ دکھادے) کہنے والا۔ یعنی حضرت موسیٰ جنھوں نے کوہِ طور پر خدا سے یہ درخواست کی تھی۔

جِلَو = آگے آگے ، ساتھ ساتھ

پڑاقے کی گوٹ = رنگ برنگی گوٹ

پلیٹ = چُنّٹ Pleat

گرنٹ = ایک ہلکا ریشمی کپڑا

یاقوتِ احمر = سُرخ رنگ کا قیمتی پتھّر جسے مانک کہتے ہیں۔

توڑا = زیور کی قسم کی زنجیر

گنگا جمنی = سونے اور چاندی کی ملاوٹ سے بنا ہوا

لچھّی / لچھّا = بازو یا پاؤں میں پہننے کا ہلکا زیور

آبِ رواں = بہت ہلکا اور نفیس سوُتی کپڑا

کڑے شیر دہاں = وہ مُنہ کھُلے ہوئے کڑے جن کے سروں پر شیر کے سر بنے ہوتے ہیں۔

کریلی = باریک چوڑی

یکّہ = ایک چوڑا تعویذ نُما زیور

انتی = کان کے اوپری حصّے میں پہنی جانے والی چھوٹی چھوٹی بالیاں۔

چلیپا = گُندھی ہوئی

چھپکا = جھومر کی قسم کا ایک زیور، جو سر میں بائیں طرف لگایا جاتا ہے۔

مچھلی = مچھلی کی شکل کا ایک چھوٹا سا زیور

فردی بوٹی = زری کی بوٹی

شربتی = ایک ہلکا سوتی کپڑا

دُھکدُھکی = گلے میں ڈالنے کا ایک چھوٹا زیور

گھنٹی ہوئی = پرانے زمانے میں ٹکٹ کی کھڑکی خاص خاص وقتوں پر کھلتی تھی۔ کھڑکی کھلنے کے پہلے گھنٹی بجا کر لوگوں کو مطلع کرتے تھے۔

بیس واڑہ = ایک علاقہ جہاں کے لوگ بڑے اونچے قد کے ہوتے ہیں۔

قرولی = شکاری چاقو کی طرح کا خنجر جسے کمر میں باندھتے تھے۔ خوجی بات بات پر قرولی مارنے کی دھمکی دیتا ہے حالانکہ وہ بہت چھوٹے قد کا، دُبلا پتلا اور ڈرپوک شخص ہے۔

پنتھر بگڑنا = حال خراب ہونا (مار یا دھکّے کھانے کی وجہ سے)

غور کرنے کی بات

اقتباس نمبر ایک :

" ایک دفعہ ہی" یہاں لفظ "ہی" کی وجہ سے معنی بالکل بدل گئے ہیں۔

صرف "ایک دفعہ" کہتے تو مراد ہوتی کہ کسی پرانی بات کا ذکر ہے۔ "ایک دفعہ ہی" سے مراد ہوئی : اچانک ، اُسی وقت۔

"فوق البھڑک" یہ دل چسپ لفظ اب صرف مزاحیہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دیسی لفظ "بھڑک" پر عربی کا الف لام لگانا بہت خوب تھا، لیکن لوگوں نے اس کو غلط سمجھ کر رواج نہ دیا۔

"خود کیسی ہوگی" کی جگہ "خود کیسی نہ ہوگی" زیادہ زور رکھتا ہے کیونکہ "کیسی ہوگی" میں سوال کا پہلو زیادہ ہے اور "کیسی نہ ہوگی" میں شوق اور تعجب کا۔

دیکھیے اس چھوٹی سی عبارت میں سرشار نے کتنے رنگ ، زیور اور کپڑے جمع کر دیے ہیں۔ مہری کے طرّار انداز کو نمایاں کرنے کے لیے پورا بیان تیز رفتار ہے۔ رنگینی کو بڑھانے کے لیے پوری عبارت کو ہم قافیہ رکھا ہے۔

"ع" مصرع کا مخفّف ہے۔ کسی عبارت میں مصرع لکھنے سے پہلے یہ نشان لگانے کا مطلب ہے کہ آگے کسی شعر کا مصرع لکھا جائے گا۔ عبارت کے درمیان آنے والے شعر کو اس نشان سے ظاہر کیا جاتا ہے "ے"

اقتباس نمبر دو :

" اسٹیشن پر داخل ہوئے۔" یہ پرانے زمانے کا محاورہ ہے۔ بتائیے کہ اس زمانے میں یہ بات کس طرح کہیں گے ؟

ریل گاڑی کا بنگالی بابو "غُل" کو "گول" کہتا ہے۔ خوجی بڑی حاضر جوابی سے "غل" کے جواب میں "غولِ بیابانی" کا فقرہ استعمال کرتا ہے ۔

بتائیے کہ خوجی کی نظر میں ریل کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے ؟

مشق اور مطالعہ

(1) "فسانۂ آزاد" کا خلاصہ کئی بار چھپ چکا ہے۔ اگر آپ کی لائبریری میں دستیاب ہو تو اس کے کچھ حصّے پڑھیے۔

(2) مہری کا سراپا اس کی خوب صورتی کو زیادہ ظاہر کرتا ہے یا اس کے بناؤ سنگار کو؟ خوب صورتی اور بناؤ سنگار کو ظاہر کرنے والے فقرے الگ الگ لکھیے اور بتائیے کہ کون سے فقرے ایسے ہیں جن سے دونوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

شِبلی نُعمانی

(1857 – 1914)

شِبلی اعظم گڑھ کے ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1884 میں انھوں نے علی گڑھ کالج کے شعبۂ عربی فارسی میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہاں انھوں نے سرسیّد اور کالج کے انگریز پرنسپل آرنلڈ کے زیرِ اثر نئے خیالات سے آگاہی حاصل کی۔ سرسیّد کی صحبت نے شبلی کے جوہرِ قابل کو اور بھی چمکا دیا۔

علی گڑھ میں کئی سال رہنے کے بعد شبلی نے کچھ دن ریاست حیدر آباد کے "دارالتّرجمہ" میں کام کیا۔ پھر انھوں نے لکھنؤ میں "نَدوَۃ العُلما" کے نام سے ایک اعلا درس گاہ قائم کی۔ یہ درس گاہ بہت کام یاب ہوئی اور اب بھی اپنی پوری شان کے ساتھ باقی ہے۔ ندوے سے الگ ہوکر شبلی نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں "دارالمصنّفین" کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک علمی اور تحقیقی ادارہ ہے جو اب بھی موجود اور اپنے کام میں مصروف ہے۔

انّیسویں صدی کے آخری پچّیس برسوں میں اردو علم و ادب کے میدان میں کئی غیر معمولی لوگ نمایاں ہوئے۔ ان میں سے بعض مثلاً سرسیّد احمد، محمد حُسین آزاد، الطاف حسین حالی اور نذیر احمد سے آپ واقف ہیں۔ شبلی ان سب سے بعد میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ان سب سے کم عمر بھی پائی۔